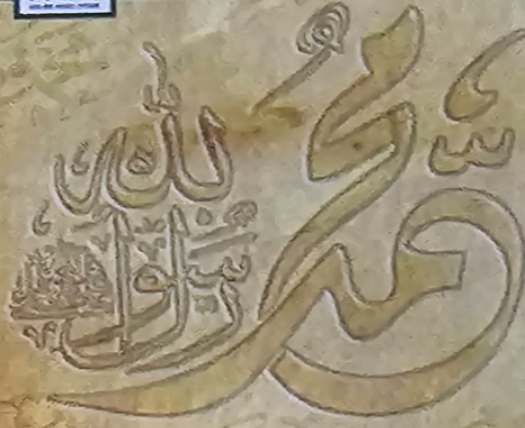




سیرت النبی
صلی اللہ علیہ وسلم
ڈاکٹر اسرار احمد



سیرت النبی
صلى الله عليه وآله وسلم
ڈاکٹر انیسہ احمد

سیرت النبی
صلى الله عليه وآله وسلم

ڈاکٹر انیسہ احمد



بعثت محمدی

صلی اللہ علیہ وسلم

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظ قرآن حکیم میں تین مقامات (۱) پر وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ ان میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے، جبکہ پورے قرآن مجید میں یہ الفاظ کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے۔ ان الفاظ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی مشہور تالیف ”ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء“ میں مفصل کلام کیا ہے اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہر نوع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے ان الفاظ مبارکہ پر غور و تدبر لازمی ہے۔

ان الفاظ پر توجہ مرکوز کیجئے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا: ایک ”الہدیٰ“ اور دوسرے ”دین حق“۔

(۱) التوبہ: ۳۳، الفتح: ۲۸ اور القف: ۹۔ ترجمہ: ”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول

(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اسے کل دین پر“۔

”الہدیٰ“

”الہدیٰ“ کو وسیع لغوی مفہوم پر رکھیے تب بھی بات غلط نہ ہوگی، لیکن نظائر قرآنی کی مدد سے اس کی مراد کے تعین کی کوشش کی جائے تو وہ ہے ”قرآن حکیم“۔ اس لیے کہ وہی **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** ^(۱) بھی ہے اور **هُدًى لِّلنَّاسِ** ^(۲) بھی۔ اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ **وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا يَّهْدِيْ بِهٖ مَّنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا** ^(۳) اور یہ بھی کہ **اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِيْ لِلَّتِي هِيَ اَقْوَمُ** ^(۴) اور وہی ہے کہ جسے جنوں کے ایک گروہ نے سنا تو فوراً پکارا ٹھے کہ **اِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۙ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَامْتَابِهٖ** ^(۵)

مزید برآں سورۃ الحديد کی آیت ۲۵ میں ”ارسال رسل“ کے ضمن میں فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ

”ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح تعلیمات اور روشن نشانیوں کے ساتھ اور

اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان“۔

ظاہر ہے کہ اس آیت مبارکہ میں جس طرح **الْمِيزَانَ** کو **دِينِ الْحَقِّ** کے قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح **الْكِتٰبَ** ٹھیک اسی مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیت زیر بحث میں **الْهُدًى** کا لفظ آیا ہے۔ گویا **الْهُدًى** سے مراد بعثت محمدیؐ کے ضمن میں سوائے **الْقُرْآنِ** کے اور کچھ نہیں۔ (واضح رہے کہ سورۃ الحديد **اُمُّ الْمُسَبِّحَاتِ** کا درجہ رکھتی

(۱) البقرة: ۲، ”ہدایت پر ہیزگاروں کے لیے“۔

(۲) البقرة: ۱۸۵، ”ہدایت پوری نوع انسانی کے لیے“۔

(۳) الشوریٰ: ۵۲، ”لیکن بنادیا ہم نے اسے روشنی، ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعے جسے چاہیں اپنے بندوں میں سے“۔

(۴) بنی اسرائیل: ۹، ”یقیناً یہ قرآن راہ دکھاتا ہے وہ جو سب سے سیدھی ہے“۔

(۵) الجن: ۲، ۱، ”ہم نے سنا ایک قرآن بہت اچھا، جو ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف تو ہم ایمان لے آئے اس پر“۔

ہے اور اس کی اسی ایک آیت کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے پوری سورۃ القہف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیر بحث الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں۔

”دین الحق“

اسی طرح دین الحق کو بھی خواہ ظاہری ترکیب اضافی پر محمول کر لیا جائے گویا اس کا ترجمہ کیا جائے ”حق کا دین“ خواہ اسے ترکیب توصیفی بشکل ترکیب اضافی مان کر ترجمہ کر لیا جائے ”سچا دین“ (جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے!) معنی و مراد کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو بہر صورت ایک ہی ہیں یعنی ”اللہ کا دین“ اس لیے کہ سچا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہو سکتا ہے اور ذات حق بھی ذات باری تعالیٰ سبحانہ و تعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے؟ بفحوائے آیات قرآنی:

(۱) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (الحج: ۶، ۶۲)

”یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے حق“ (یعنی کامل حق یا سراپا حق)

(۲) وَيَعْلَمُونَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ (النور: ۲۵)

”اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے کھلا حق“۔

گویا ”دین الحق“ بالکل مساوی و مترادف ہے ”دین اللہ“ کے! (اور عجیب بات ہے کہ قرآن حکیم میں تین ہی بار آیت زیر بحث کے ضمن میں ”دین الحق“ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور پورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ ”دین اللہ“ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں!) (۱) لفظ ”دین“ پر توجہ کو مرکوز کیجئے تو عربی لغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ ”اساس القرآن“ یعنی سورۃ الفاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے یعنی بدلہ (۲)

(۱) آل عمران: ۸۳، النور: ۲، النصر: ۲

(۲) یہاں چاہیں تو عربی کی کہاوت ”کما تدین تدان“ (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) اور دیوان حماسہ کے مشہور مصرع کے الفاظ ”حداہم کما دانوا“ (ہم نے ان کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا) بھی ذہن میں مستحضر کر لیں اور اسے بھی کہ عربی میں ”دین“ کہتے ہیں قرض کو جس کا لوٹا یا جانا لازم ہوتا ہے۔

(جولامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہوگا اور بدی کا سزا کی شکل میں) (۱)
 چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے
 اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزاء و سزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے:

(۱) أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْإِيمَانِ ۖ (الماعون)

”تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزاء و سزا کو؟“

(۲) فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالْإِيمَانِ ۚ (التین)

”تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے تجھے جزاء و سزا کے جھٹلانے پر؟“

(۳) كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالْإِيمَانِ ۖ (الانفطار: ۹)

”کوئی نہیں بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزاء و سزا کو!“

اور سورۃ الفاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے یہ لفظ ”یوم“ کی
 اضافت کے ساتھ یوم قیامت کے معنی میں یعنی بدلے یا جزا و سزا کا دن!

پھر چونکہ بدلے اور جزا و سزا کا تصور لازماً مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اس کی
 اطاعت و متابعت کے تصور کو، لہذا لفظ ”دین“ نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس سے اٹھ
 کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اولاً اطاعت کا مفہوم پیدا ہوا۔ چنانچہ
 قرآن حکیم میں دو مرتبہ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ اور ایک بار مُخْلِصًا لَهُ دِينِي اور چھ مرتبہ
 مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ کے الفاظ اطاعت اور بندگی و فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے
 خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آئے ہیں جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں
 اضافہ کیا جاتا ہے۔ حَنِيفًا يَاحْتَفَاءَ کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآن حکیم کے ان
 الفاظ مبارکہ کا: اَلَا لِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (الزمر: ۳) اور وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا ط (النحل: ۵۲)
 اور بالآخر اس نے نظام اطاعت کی صورت اختیار کر لی جس کی اضافت حقیقی تو اس ذات کی
 طرف ہوتی ہے جسے مطاع مان کر نظام زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا گیا ہو، جیسے

(۱) جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ثُمَّ لَتَجْزُونَ بِالْإِحْسَانِ إِحْسَانًا وَبِالسُّوِّ سُوءًا
 ”پھر لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا!“

سورہ یوسف میں فرمایا:

كَذٰلِكَ كُنَّا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِیَاخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (یوسف: ۷۶)

”اس طرح ہم نے تدبیر کر دی یوسف کے لیے، ورنہ بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ مجاز نہ تھا کہ اپنے بھائی کو روک سکے۔“

گویا مصر کے اُس دور کے رائج الوقت نظام ملکیت کو جس میں مطاع مطلق کی حیثیت بادشاہ یا مَلِک کو حاصل تھی، قرآن حکیم دِیْنِ الْمَلِک سے تعبیر کرتا ہے اور ٹھیک اسی مفہوم (Sense) میں قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں ”دِیْنِ اللّٰہ“ کے الفاظ سورۃ النصر میں:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَآیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝

”جب آگئی اللہ کی مدد اور فتح، اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔“

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سال سے زائد جدوجہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ اللہ ہی کو مطاع مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظام اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے قرآن مجید نے ”دِیْنِ اللّٰہ“ کے الفاظ سے تعبیر کیا..... (اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر گز غلط نہ ہوگا اگر دور جدید کے محبوب و مقبول طرز حکومت یعنی جمہوریت کو جس میں غلط یا صحیح بہر حال نظری طور پر حاکمیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں جمہور، تعبیر کیا جائے ”دِیْنِ الْجُمُہُور“ کے الفاظ سے!)

البتہ قرآن حکیم میں ”دین“ کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے جسے اضافت مجازی قرار دیا جانا چاہیے، جیسے دِیْنِیْ یَا دِیْنُکُمْ یَا دِیْنُہُمْ۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظام اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا اس کا دین بن گیا۔ (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس مشہور دعا کے الفاظ میں: اَللّٰهُمَّ اَنْصُرْ مَنْ نَّصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ..... الخ۔ اسلام اصلاً تو دین اللہ ہے لیکن مجازاً دین محمد بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں، فِدَاہُ اَبَائِنَا وَاُمَّہَاتِنَا۔

حاصل کلام یہ کہ دین الحق سے مراد ہے ”دین اللہ“ یعنی وہ نظام زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی و مطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو اور یہ دراصل خاتم النبیین و آخر المرسلین ﷺ کو عطا شدہ اتمامی و تکمیلی صورت ہے اس الہیہ ان کی جو تاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر قدرے مختلف صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو، علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام..... اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس ”نظام عدل اجتماعی“ کی جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے ”تا کہ لوگ قائم رہیں اس نظام قسط پر“ (۱)

آخری بعثت کے لیے وقت کی تعیین و انتخاب میں حکمت

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختم نبوت اتمام نعمت شریعت اور تکمیل دین حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمت الہی کا فرما ہے اس کی جانب بھی انہی دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے۔ اس لیے کہ بعثت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نوع انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسل انسانی گویا عہد طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی: (۱) ایک اس اعتبار سے کہ عقل انسانی اپنی پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ نسل انسانی عقلی و فکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور جنہوں نے مذاہب عالم فلسفہ تصوف اور علم کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا، گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھ سو سال قبل مسیح سے چھ سو سال بعد مسیح تک کا عرصہ فکر انسانی کے عہد طفولیت سے نکل کر عقل و شعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہب عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتب فلسفہ بھی وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ضرورت ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ نہ کوئی واقعہ نیا مذہب وجود

(۱) لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحمدید: ۲۵)

میں آیا ہے نہ حقیقتاً جدید مکتب فکر یا مدرسہ فلسفہ۔ اور فلسفہ جدید کے نام سے بھاری بھر کم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتب فکر سامنے آئے ہیں ان کی حیثیت نئی بوتلوں میں پرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں..... اب اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزوں و مناسب تھی اس کے لیے کہ ”نوع انسان را پیامِ آخری!“ یعنی قرآن حکیم اَلْهُدٰی بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اس کی ابد الابد تک حفاظت کا اہتمام و انتظام بھی کر دیا جاتا کہ نوع انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ:

۱- اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ اَقْوَمُ (الاسراء: ۹)

”یقیناً یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔“

۲- وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (الاسراء: ۱۰۵)

”اور اس (قرآن) کو ہم نے حق ہی کے ساتھ نازل فرمایا اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا۔“

۳- قُلْ لِّیْنَ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا یَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝ (الاسراء: ۸۸)

”کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جن اس پر کہ لے آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لایا پائیں گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی بن جائیں۔“

اور اس نے پوری نوع انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ:

وَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاتُّوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (البقرہ: ۲۳)

”اور اگر ہو تم شک میں اس کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم نے اپنے

بندے پر تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورۃ!“

افسوس کہ تا حال قرآن حکیم کے وجوہ اعجاز میں سے اصل توجہ صرف اس کے ادبی و لغوی محاسن اور انداز و اسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت و بلاغت ہی پر صرف کی جاتی رہی